(غلام گردش)

لعل و گُہر

1991 میں بہاولپور پہنچا تو پورا شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ زبان، لوگ، روایات اور ادب و آداب، ہر چیز مکمل طور پر مختلف تھے۔ سیکریٹریٹ سے جب بہاولپور کیلئے پوسٹنگ آرڈر ملے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہاں پہنچنا کیسے ہے۔ راستہ کون سا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ضلع میں ایک پوسٹ ہوا کرتی تھی۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر۔ نوٹیفکیشن میں درج تھا کہ مجھے اس پوسٹ پر تعینات کر دیا گیا ہے۔ ویسے یہ عہدہ بھی میرے لیے عجیب سا تھا۔ کئی دوستوں سے مشورہ کیا، راستہ معلوم کیا اور بہاولپور پہنچ گیا۔ غروبِ آفتاب سے تھوڑا سا پہلے کا وقت تھا۔ شہر داخل ہونے سے پہلے ایک بھرپور بلکہ طاقتور دریا تھا۔ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ انتہائی چوڑا دریا۔ پُل پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے حدِ نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ آج سے پچیس برس پہلے جہاں پانی کی لہریں اور روانی موجود تھی، آج وہاں خشکی، ریت کے ٹیلے، پانی کا انتظار کر رہے ہیں۔ چند دن پہلے بھرپور دریا کو خشک دیکھ کر عجیب سا غم ہوا۔ ویسے تو اب بہت کم معاملات ایسے ہیں، جن سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسلیے کہ ہمارے جیسے معاشروں میں ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانا عین ثواب سمجھا جاتا ہے۔ جس شعبہ سے میں تعلق رکھتا ہوں، اس میں تو اکثریت افسران عام لوگوں کو انسان سمجھنے سے بھی گریزاں ہیں۔ مگر صاحبان، ہمارے یہ گوشت پوست کے سسکتے ہوئے عام آدمی ہی ہماری اصل طاقت ہیں۔ آج تک ہم میں سے کوئی بھی انکی اَبتر صورتحال کو بہتر نہیں بنا سکا۔ شائد آنے والے کئی سو سال، اسی مفلوک الحالی میں ہی سانس لیتے رہینگے۔

پچیس برس پہلے بہاولپور سے متصل بھرپور اور توانا دریا آپکا استقبال کرتا تھا۔ اس شہر میں زندگی میں پہلی بار سائیکل رکشہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ نحیف و نادار لوگ، تین پہیہ کی سائیکل کو جانوروں کی طرح کھینچتے تھے، چلاتے تھے۔ پچھلی سیٹوں پر تین سواریاں بیٹھی ہوتی تھیں۔ یہ منظر میرے لیے عجیب تو تھا ہی مگر تکلیف دہ زیادہ تھا۔ انسان ہی انسان کو کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجا رہا تھا۔ خیر اس وقت کے وزیراعظم نے ایک دورہ میں اس سواری کو ختم کرنے کا حکم دیا۔ ضلعی انتظامیہ نے صرف اور صرف تین مہینہ میں پورے بہاولپور ضلع بلکہ ڈویژن سے سائیکل رکشہ کو ختم کر دیا اور متبادل روزگار کے مواقع فراہم کیے۔ یہ اتنا بڑا مقامی انقلاب تھا جس پر میں کسی اور وقت قلم اُٹھاؤنگا۔ ایک دو دن بعد معلوم ہوا کہ بہاولپور ڈویژن کے کمشنر مرتضٰی بیگ برلاس نام کے افسر ہیں۔ جس طرح شہر سے متصل دریا اور سائیکل رکشہ میرے لیے اجنبی تھا۔ بالکل اسی طرح یہ افسر بھی میرے لیے اجنبی تھا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ایک شاعر ہیں۔ ملاقات ہوئی۔ سادہ، پُر وقار سا سنجیدہ آدمی تھا۔ کسی طرف سے بھی شاعر معلوم نہ ہوتا تھا۔ آج لوگوں کو اندازہ شائد نہ ہو کہ پچیس تیس برس پہلے کا کمشنر، ڈی سی اور اے سی کتنے وسیع اختیارات کے مالک تھے۔ آج کل کے افسر، اس دور کا شائد سوچ سکتے ہیں۔ مگر اس بڑے قد کا تصور نہیں کر سکتے۔ برلاس صاحب سے ملنے کے بعد باہر نکلا تو ذہن میں پہلا خیال یہی تھا کہ مجھے غلط بتایا گیا ہے کہ یہ شخص شاعر ہے۔ یہ گمان اگلے چند دنوں میں مکمل طور پر بے محل ثابت ہوا۔ برلاس ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ ہاں ایک اور بات، عام لوگوں میں اسکی شہرت انتہائی ایماندار شخص کی تھی۔ یہ نیک نامی ہی افسر کا اصل سرمایہ ہوتی ہے۔ آج کے ماحول میں شائد غلط لکھ گیا ہوں۔ موجودہ افسران کی

اکثریت کی شہرت انکے لمبے چوڑے بینک بیلنس اور وسیع جائیداد کی مرہونِ منت ہے۔ایسے بے شمار لوگوں کو جانتا ہوں جو سول سروسز اکیڈمی، سائیکل پر آئے، اور آج ارب پتی ہیں۔انہیں کوئی مسئلہ یا پریشانی نہیں۔شہباز شریف کے دور میں بھی وہ مزے میں تھے اور بدلتے ہوئے پاکستان میں تو انکے اور بھی زیادہ وارے نیارے ہو چکے ہیں۔کرپشن کا زور بالکل وہی ہے جو آج سے پہلے تھا۔یہ ایک تکلیف دہ سچ ہے جسکو نئے پاکستان میں کوئی بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔بات کرنے کیلئے بھی تیار نہیں۔مجھے دیگر صوبوں کا علم نہیں، مگر ایمانداری کے اعتبار سے پنجاب میں بہت کم فرق پڑا ہے۔بہر حال آج سے تین چار دہائیاں قبل افسران نیک نامی اور ایمانداری کو اپنی طاقت سمجھتے تھے۔یہ نہیں کہ اس وقت مالی بے ضابطگی نہیں تھی۔مگر کافی حد تک کم تھی۔مرتضی بیگ برلاس کی بطور کمشنر، شہرت حد درجہ قابل رشک تھی۔ایک دو ماہ میں محسوس ہوا کہ لوگ انکی دل سے عزت کرتے ہیں۔احترام کرتے ہیں۔یہ ہر افسر کے نصیب میں نہیں ہوتا۔

تھوڑے دن بعد، برلاس صاحب نے سرکٹ ہاؤس میں ایک مشاعرہ منعقد کر دیا۔یہ میری زندگی کا دوسرا مشاعرہ تھا۔پہلا سول سروسز اکیڈمی کے ڈی جی، شیخ منظور الٰہی صاحب نے کروایا تھا۔جس میں پاکستان کے چوٹی کے شعراء موجود تھے۔منیر نیازی سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔خیر بہاولپور کے سرکٹ ہاؤس میں منعقد مشاعرہ، توقع سے بڑھ کر بہترین تھا۔چند مقامی شعراء اکرام اور کچھ شاعر باہر سے آئے ہوئے تھے۔اسکے بعد معمول سا بن گیا۔تھوڑے وقفے کے بعد، برلاس صاحب کوئی نہ کوئی ادبی تقریب برپا کر دیتے تھے۔مجھے پاکستان ہی نہیں بلکہ برصغیر کے اعلیٰ ترین شعراء سے ملاقات کا موقعہ بارہا ملا۔بڑے بڑے افسانوی نام۔احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، قتیل شفائی، نوشی گیلانی، سلیم کوثر بلکہ ہر طرح کے بے مثال شاعروں سے ذاتی حیثیت میں کلام سننے کا موقع ملا۔انکی آپس کی چپقلشوں اور دشمنیوں کو دیکھنے کا بھی حسنِ اتفاق رہا۔برلاس صاحب کا کمال یہ تھا کہ کسی بھی ادبی گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔بلکہ ہر طرح اور ہر سطح کے ادبی لوگوں سے ذاتی رسم وراہ رکھتے تھے۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ برلاس صاحب کو انتظامی افسر نہیں ہونا چاہیے تھا۔بلکہ انہیں صرف اور صرف شاعری کرنی چاہیے تھی۔وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور ہیں۔بلند اور پاٹ دار آواز شائد ریڈیو میں تھوڑا عرصہ کام کرتے ہوئے پختہ ہوگئی۔یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے ریڈیو پاکستان پر کام کیا کہ نہیں۔مگر ذرا ذرا سا یاد ہے کہ ایک بار انہوں نے خود ذکر کیا تھا۔

بہاولپور پورے تین سال رہا۔اس میں تقریباً دو برس، برلاس صاحب کمشنر رہے۔مجھے اس بڑے شخص کو دیکھنے کا بھرپور موقعہ ملا۔ایک شاندار اور منفرد درخت کی طرح ایستادہ انسان۔برلاس صاحب، لاہور آ گئے مگر ملاقاتیں جاری رہیں۔ریٹائر ہوئے تو پھر بھی گاہے بگاہے ملاقاتیں برقرار رہیں۔پھر میں بلوچستان چلا گیا۔ملنے جلنے میں طویل وقفہ آ گیا۔عجیب بات ہے۔آج سے چند دن پہلے انکا فون آیا۔وہی پاٹ دار آواز تقریباً پندرہ برس بعد سننے کا موقعہ ملا۔انہوں نے ایڈریس پوچھا اور پھر ایک کتاب موصول ہوئی۔یہ انکے اپنے شعروں میں سے منتخب مجموعہ تھا۔اسکا نام "لعل و گُہر" ہے۔ویسے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مرتضیٰ بیگ برلاس چھ خوبصورت کتابوں کے خالق ہیں۔شاعری کی یہ کتابیں، تیشۂ کرب، گرہ نیم باز، ارتعاش، سحر چشیدہ، اضطرار اور تکملہ کے نام سے موجود ہیں۔"لعل و گُہر" انہی کتابوں میں سے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔غور سے اس کتاب کو پڑھا اور دیر تک خوبصورت اشعار میں موجزن

رہا۔ چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔

- کبھی مقطع نہ کہا اور نہ تخلص رکھا
اپنی پہچان ہے اسلوبِ سخن سے اپنے

- دوستوں کے حلقے میں ہم وہ کج مقدّر رہیں
افسروں میں شاعر ہیں، شاعروں میں افسر ہیں

- کتاب سادہ رہے گی کب تک کہیں تو آغاز باب ہوگا
جنہوں نے بستی اُجاڑ ڈالی کبھی تو ان کا حساب ہوگا

- مجرم ہو بارسوخ تو قانون کچھ نہیں
کیا لکھ دیا گیا ہے، یہ میزانِ عدل پر

- ہے یوں تو میرے رقیبوں میں اختلاف بہت
مرے خلاف مگر اتحاد کتنا ہے

- میں نے کہا کہ بن ترے کیسے کٹے گی زندگی
جلتے ہوئے چراغ کو اس نے بجھا دیا کہ یوں

- ایسی بستی کو زمیں چاٹ لیا کرتی ہے
ظلم بڑھ جائے جہاں حد سے زیادہ، برلاس!

- اب جنگ ہے یہ علم کی طاقت کی نہیں ہے
بازو پہ نہ کر مان، تو ہاتھوں میں قلم لے

- ہم تو چراغ اوّل شب ہیں، اوّل شب بجھ جائیں گے ہم
تم ہی یارو! آخر شب تک دیپ سے دیپ جلاتے رہنا

- ضبط کا حوصلہ دنیا کو بھی بخشا ہوتا
تو نے بخشی تھی اگر جرأتِ اظہار مجھے

- دور سے دیکھتے ہیں، بچ کے نکل جاتے ہیں
کوئی آتا نہیں گرتی ہوئی دیوار کے پاس

- ان کو آنکھیں مت کہو، چہرے پہ دو دھبّے کہو
ورنہ اتنا ظلم کب آنکھوں سے دیکھا جائے ہے

- میں نے دنیا کے دکھ بانٹے، میرا درد بٹائے کون

جس کی کڑیاں ٹوٹ رہی ہوں اس چھت نیچے آئے کون

- زمانہ بھر جسے نااہل و نامراد کہے

مگر وہ خود کو سمجھتا ہے معتبر پھر بھی

- مجھے جو خلق کیا بے ضمیر لوگوں میں

مرے خدا! مجھے بس یہ سزا ہی کافی ہے

- اب تو ہمارا ہاتھ عقیدت سے تھام لو

برسوں طوافِ کوئے وفا کر کے آئے ہیں

- اِک برگِ سبز، شاخ سے کر کے جدا بھی دیکھ

میں پھر بھی جی رہا ہوں مرا حوصلہ بھی دیکھ

- ہم سفر وہ کیا ہوا کہ دوست بھی دشمن ہوئے

اس رفاقت نے ہمیں تو اور تنہا کر دیا

- نام اسکا بادشاہت ہو کہ ہو جمہوریت

منسلک فرعونیت مسند سے تب تھی اب بھی ہے

- چاہو جدھر کو ہانک دو اپنے مفاد میں

جمہور نا سمجھ ہو تو جمہوریت ہے کیا

- میں بجھتے بجھتے دھوئیں کی لکیر چھوڑوں گا

یہ بادِ تند ذرا سوچ کر بجھائے مجھے

فیض احمد فیض نے مرتضٰی برلاس کے متعلق کہا تھا کہ انکی شاعری ایک ایسی آواز ہے جو اپنے سوز و ساز اور جذب و خلوص کے سبب، قلب و گوش تک پہنچ جاتی ہے۔ فیض کے ان جملوں کے بعد مرتضٰی بیگ برلاس کی شاعری کے متعلق کیا لکھوں، کیونکر لکھوں اور کیسے لکھوں!

راؤ منظر حیات